فہمیدہ ریاض کی نثر کا جہانِ حیرت

رافعہ ملک [1]م ڈاکٹر شازیہ عنبریں **

Abstract:

"Though Fehmeeda Riyaz (July 1946-November 2018) was basically a poetess, Yet she has to pen fiction, translations, columns and pieces of criticism to earn bread for her children and extend her resources to educate her children. In Pakistan a woman writer can achieve such economic targets if she is not rebel or non conformist.Her political views were quite evident so the doors of prestigious cultural and academic institutions were opened and closed quite often. Perhaps Oxford Press (Under Ammeena Syed) was her last shelter where she tried to write, publish and earn according to the contract / terms for much longer time. During this assignment he tried to maintain her status as fiction writer through the courtesy of Dunya Zaad (Asif Farrukhi) and Aaj Karachi (Ajmal Kamal).That is the reason that after her death Asif Farrukhi has found many incomplete scripts and unfinished diaries [Dunyazaad 48] .In this acrticle Dr.Shazia Ambreen Assistant Professor BZU Multan and her PhD scholar Rafia Malik have evaluated her another wonder world of Prose."

شاید ہی اُردو کی کسی شاعرہ کواتنی بھرپورزندگی (50کتب،جہاں گردی،اشاعتی اور علمی اداروں کی سربراہی،جلا وطنی،قلم کی مزدوری، اپنے سیاسی نظریات کے سبب عقوبت کے ساتھ پذیرائی اور پھر جوان بیٹے کی موت) بسر کرنی پڑی ہوجیسی فہمیدہ ریاض (پ:28جولائی 1946ء میرٹھ بھارت،و:21نومبر2018ء لاہور)نے ایک جنم میں بسر کی۔ اسی طرح پاکستان میں شاید ہی کوئی اور شاعرہ ہو جو یو پی سے تعلق رکھتے ہوئے سندھ دھرتی میں آئی ہو اور اس دھرتی کو اپنی ماں بنا لیا ہو۔اس کے دو بڑے تخلیق کار شاہ لطیف بھٹائی اور شیخ ایاز اپنی رُوح میں اُتار لئے ہوں۔ اسی طرح کون ایسی شاعرہوگی جس نے اُردو، انگریزی، سندھی اور فارسی کے ساتھ سنسکرت بھی سیکھی ہو اور مارکسزم سے اپنا فکری سفر کرنے والی، آخر میں فرید الدین عطار اور جلال الدین رُومی کی فکر سے اس طرح متاثر ہو ئی کہ آخری وقت میں اُس کے قریب رہنے والے اُسے متصوفانہ سرگوشیاں کرتے اور آہٹیں سنتے دیکھتے ہیں۔ یہ ماجرا علم کا نہیں، نہ زبانیں سیکھنے کا ہے، اُس نے اپنے جسم اور رُوح پر جو گھاؤ سہے۔ اُس نے اسے ایک منفرد تخلیق کار بنا دیا۔ سلطانی جمہور، انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق کی علم بردار ترقی پسند ادیب فہمیدہ ریاض 21-نومبر 2018 کی شب لاہور میں خالق حقیقی سے جا ملیں۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے کراچی سے لاہور پہنچی تھیں۔ فہمیدہ ریاض نے اپنے اسلوب میں پامال راہوں اور عا م روش سے ہٹ کر اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کو شعار بنایا۔ ا یک زیرک، فعال، جری اور حریتِ ضمیر سے جینے کی آرزومند ادیبہ کی حیثیت سے فہمیدہ ریاض نے ان موضوعات پر بھی کھل کر لکھا جو خواتین تو کیا کمزور دل مردوں کے لیے بالعموم شجر ممنوعہ سمجھے جاتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے اٹھائیس جولائی1946کو میرٹھ (اتر پردیش)میں ایک علمی و ادبی

---

[1] پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے والد ریاض احمد کا تعلق شعبہ تعلیم سے تھا،مگر وہ چار سال کی تھیں،جب والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو والدہ حسنہ بیگم نے گھر کا انتظام سنبھالا اور اپنی ہونہار بیٹی کی بہترین تربیت کی۔ فہمیدہ ریاض کو بچپن ہی سے شاعری کا بہت شوق تھا۔(۱)

جب وہ پندرہ برس کی تھی تواس کی پہلی نظم احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والے رجحان ساز ادبی مجلہ فنون میں شائع ہوئی۔ فہمیدہ ریاض نے ریڈیو پاکستان سے نیوز کاسٹر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بائیس برس کی عمر میں ان کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ فہمیدہ ریاض نے زمانہ طالب علمی میں سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ پاکستان میں صدر ایوب کے دور حکومت(1958-1969) میں نافذ ہونے والے یونی ورسٹی آرڈیننس، پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس، فیملی لا آرڈیننس اور ایبڈو کے خلاف فہمیدہ ریاض نے بائیں بازو کی طلبا تنظیموں سے مل کر بھر پور احتجاج کیا۔ سال 1984میں ضیا الحق کے دور میں مارشل لا آرڈر کے تحت طلبا کی یونینز پر پابندی پر بھی فہمیدہ ریاض نے سخت تنقید کی۔ گریجویشن کرنے کے بعد فہمیدہ ریاض نے اپنے خاندان کی مرضی سے شادی کر لی اور شوہر کے ہمراہ برطانیہ چلی گئیں۔ برطانیہ میں قیام کے دوران میں انھوں نے بر طانیہ کے نشریاتی ادارے بی بی سی اردو سروس میں ملازمت کی۔ اس کے ساتھ ہی اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور فلم کی تیاری کے کورس میں ڈگری حاصل کی۔ اس شادی میں ان کی ایک بچی پیدا ہوئی اور اس کے سا تھ ہی شوہر نے طلاق دے دی۔ اپنے پہلے شوہر سے علیحدگی کے بعد فہمیدہ ریاض واپس پاکستان چلی آ ئیں اور کراچی میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملاز م ہو گئیں۔ جلد ہی انھوں نے اپنے ذاتی ادبی مجلہ ''آواز'' کی اشاعت کا آغاز کر دیا۔ کراچی میں ان کی ملاقات بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے فعال اور مستعد سیاسی کارکن اور سندھی قوم پرست ظفر علی اجن سے ہوئی۔ دونوں نے شادی کر لی۔ ظفر علی اجن کی کتاب''Bhutto Speaks from the Grave'' کا پہلا ایڈیشن سال 1983میں شائع ہوا جب کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سال 2007میں شائع ہوا۔(۲)

حریت فکر کے علم بردار ادیبوں کے مجلہ ''آواز'' میں شائع ہونے والے مضامین کومقتدر حلقوں نے نا پسند کیا۔ مجلہ ''آواز'' کی مجلس ادارت زیر عتاب آ گئی حکومتی احکامات کے تحت مجلہ کی اشاعت کا سلسلہ بند کر دیا گیا اور صدر ضیاالحق کی حکومت سے فہمیدہ ریاض اور ان کے شوہر کی گرفتاری کے احکامات صادر ہو گئے۔ گرفتاری سے پہلے فہمیدہ ریاض نے ضمانت کرا لی مگر ان کے شوہر کو جیل بھیج دیا گیا۔ فہمیدہ ریاض ایک عالمی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے اپنے دونوں بچوں ویرتا علی اجن اور کبیر علی اجن اور اپنی بہن کے ہمراہ بھارت گئیں اور وہیں خود اختیاری جلاوطنی اپنا لی۔ جیل سے رہائی ملنے کے بعد فہمیدہ ریاض کے شوہر بھی اپنے اہلِ خانہ کے پاس بھارت چلے گئے۔ خود اختیار کردہ جلاوطنی کے عرصے میں ا س خاندان کو امرتا پریتم کی سفارش پر بھارتی حکومت کی طرف سے سہولتیں فراہم کی گئیں۔ 1988میں جب پاکستان میں نئے انتخابات کے بعد جمہوری حقوق کی بحالی کا دور آیا توبے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت (1988-1990)میں فہمیدہ ریاض نیشنل بک کونسل (موجودہ نیشنل بک فاؤنڈیشن) کے منیجنگ ڈائریکٹر کے منصب پر فائز رہیں۔ بےنظیر بھٹو کے دوسرے دورِ حکومت (1993-1996)میں فہمیدہ ریاض وزارتِ ثقافت سے وابستہ رہیں۔ یوسف رضا گیلانی کے دور میں وہ اردو ڈکشنری بورڈ کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتی رہیں۔ فہمیدہ ریاض کا بیٹا کبیر علی اجن اعلیٰ تعلیم کے لیے سال 2000میں امریکہ چلا گیا اکتوبر 2007کی ایک منحوس شام اس خاندان کے لیے شامِ الم ثابت ہوئی جب ان کا بیٹاکبیر علی ایک گہرے تالاب میں ڈوب گیا ۔(۳)

فہمیدہ ریاض نے پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب میں گہری دلچسپی لی اور ان زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا۔ انھیں اردو، انگریزی، سندھی اور فارسی زبان پر خلاقانہ دسترس حاصل تھی۔ خواتین کے مسائل، انسانیت کا وقار اور سربلندی، حق گوئی و بے باکی، جنگ و جدال کے مسموم اثرات، دشمنی اور عداوتوں کے تباہ کن اثرات، تاریخ، سیاست اور لوک ادب فہمیدہ ریاض کے پسندیدہ موضوعات تھے۔

ترجمہ نگاری میں فہمیدہ ریاض کی خداد اد صلاحیتوں کا ایک عالم معترف ہے۔ فہمیدہ ریاض نے البانیہ سے تعلق رکھنے والے ناول نگار، شاعر اور ڈرامہ نگار اسماعیل کدرے (Ismail Kadare) کی تخلیقات کو اردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔ اسماعیل کدرے کا سال 1963میں شائع ہونے والا ناول ''مرد ہ فوج کا سالا ر(The General of the Dead Army) ''فہمیدہ ریاض کو بہت پسند تھا۔ اس ناول میں اسماعیل کدرے نے البانیہ کے اس سالار کی داستان بیان کی ہے جس کی فوج نے ہزیمت اور پسپائی کے وقت دوسری عالمی جنگ میں زبردست جانی نقصان اٹھایا۔ اسماعیل کدرے کا ایک اور معرکہ آرا ناول محصورین کا قلعہ(The Castle or The Siege) جو سال 1970میں منظر عام پر آیا اسے اسماعیل کدرے کے جرأت مندانہ منفرد اسلوب کی پہچان سمجھا جاتاہے۔ اس کے علاوہ اسماعیل کدرے کا سا ل1977میں شائع ہونے والامقبول ناول ''عظیم سرما (The Great Winter) ''بھی فہمیدہ ریاض کی توجہ کا مرکز رہا۔ فارسی زبان کے عالمی شہر ت کے حامل ممتاز شاعرمولانا جلال الدین رومی (1207-1273) کے فارسی کلام کا اردو ترجمہ کرنے کے سلسلے میں فہمیدہ ریاض کو اوّلیت کا اعزاز حاصل ہے۔ سندھی زبان کے شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی (1689-1752) اور شیخ ایاز (1923-1997) کی شاعری کا بھی فہمیدہ ریاض نے اِس مہارت سے اردو ترجمہ کیا کہ دو تہذیبوں میں سنگم دیکھ کر قاری حیران رہ جاتا ہے۔ ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد (1934-1967) کی منتخب نظموں کے تراجم پر مشتمل کتاب''کُھلے دریچے سے''فہمیدہ ریاض کی ترجمہ نگاری کی عمدہ مثال ہے۔

محمد خالد اختر(1920-2002) کے مکاتیب ان کے دم ساز محمد کاظم نے 'مکاتیبِ خضر' کے عنوان سے مرتب کئے ہیں کہ اسی عنوان سے خالد اختر نے انہیں 'فنون' لاہور میں لکھا تھا، انہی میں ایک مکتوب فہمیدہ ریاض کے نام بھی ہے،اس میں ایک اقتباس دیکھئے:

> ''انداز تمہاری نظم کا دل نشیں ہے،واسطے شاعری سے مناسبت طبیعت رکھتی ہو،'پتھر کی زبان' کیا لکھی، پتھر کو زبان دی،کوئی سمجھے تو! حسن نگارش بے پناہ اور اس کے ساتھ جو بات کہنا برملا،بے جھجک،بناوٹ نہیں،تصنع نہیں،لفاظی نہیں،یہاں اب بقراط شاعری کے پھیلے ہیں،اشعار ان کے نتیجہ دماغ سوزی و موزونی طبع کا کہیئے،کسی تعریف کے شایان نہیں ہیں،نہ نغمگی،نہ خلوصِ صداقت،گرہ دار باتیں،الفاظ وہی گھسے پٹے فرسودہ، لغت اصفہانی و ہندی و عربی ان کی البتہ مرعوب کرتی ہے،جو منشی متصدی نثر میں درج کرتے ہیں،لچ شاعری اسے کہیئے،علامات کا نیا ڈھکوسلا انہوں نے ایجاد کیا ہے۔''(۴)

اس کے حیرت انگیز جہانِ نثر کا پہلا باب ان کے پہلے افسانوی مجموعے خطِ مرموز نے کھولا جو 2002میں شائع ہوا ۔

ڈاکٹر انوار احمد نے لکھا ہے ''فہمیدہ ریاض کے افسانوی مجموعے'خطِ مرموز' کا عنوان ہی اسراریت لیے ہوئے ہے، یہ اور بات ہے کہ فہمیدہ ریاض پردہ اٹھانے کی قائل ہے اس لئے اس نام کے افسانے میں بھی یہودی معلم کے ساتھ اپنی تخلیقی ہمزاد لیلیٰ کو آخر میں جس طرح خط مرموز کے اسرارو رموز میں جسمانی اور حسی طور پر شریک دکھایا گیا ہے، وہ فہمیدہ کے مخصوص اسلوبِ حیات کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ (۵)

ڈاکٹر انوار احمد سے استفادہ کرتے ہوئے مجھے فہمیدہ ریاض کی افسانہ نگاری کے بارے میں چار باتیں بڑی واضح طور پر محسوس ہوتی ہیں۔

ا) وہ اس فنی حجاب کی ضرورت محسوس نہیں کرتی کہ متکلم سے مراد وہ خود ہے، اس میں شک نہیں کہ منٹو کے ہاں بھی مخاطب متکلم سے منٹو صاحب کہہ کر بات کرتا ہے، مگر فہمیدہ ریاض اپنے بارے میں بعض نجی تفاصیل پیش کرکے یہ امکان بھی نہیں رہنے دیتی کہ متکلم کو اُس کی ذات کا ایک تخلیقی ہم زاد خیال کیا جائے۔

ب) کشورناہید، زاہدہ حنا اور پروین شاکر جیسی شاعرات نے بھی کالم نگاری شروع کی تو اُنہیں شاید ایک وسیع تر حلقۂ قارئین میسر آیا اور غالباً یہ اطمینان بھی کہ اُن کے سماجی تصورات کا براہِ

راست اور مربوط اظہار حسبِ منشا زیادہ لوگوں تک پہنچ کر سماجی تبدیلی پیدا کرسکتا ہے۔ فہمیدہ ریاض کے بہت سارے افسانے ایسے ہیں جنہیں وہ اگر کالم کی صورت میں لکھتی تو بیشتر یہی فقرے اور فضا اُن میں ہوتی، جیسے 'ورچوئل ریلیٹی'۔

ج) فہمیدہ ریاض کی بعض کہانیاں ایسی ہیں جو کسی رپورتاژ، سفرنامے یا خودنوشت کا بھی حصہ ہوسکتی تھیں جیسے 'کیا گلابی کبوتر جیت گئے؟' (سفرنامہ) 'بابل' (رپورتاژ) 'تکون کے دائرے' (خودنوشت)۔

د) فہمیدہ کے ہاں بعض اوقات اپنے مطالعے کی لذت میں شریک کرنے کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے، جیسے 'بابرنامہ' پڑھنے کے بعد وہ اپنے حاصلِ مطالعہ کو تخلیقی طور پر بازیاب کرنا چاہتی ہے تو 'تاریخ کے مینار' لکھتی ہے اور اُس کے آخر میں درج کردیتی ہے 'ماخوذ از بابرنامہ''

اسی طرح 'قافلے پرندوں کے' کے آخر میں بھی وہ یہ نوٹ دیتی ہے ''پرندوں کا کردار اور چند مکالمے منطق الطیر سے مستعار ہیں، کہانی کے پیچ و خم بہرحال اس کے اپنے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر منطق الطیر میں بارہا آتا ہے، مثنوی کے اختتام پر سیمرغ کے محل کے پہرے دار پرند منزل تک پہنچ جانے والے تیس پرندوں کو اُن کی زندگی کا نوشتہ پیش کرتے ہیں، اس میں درج ہے کہ اپنے یوسف کو اندھے کنوئیں میں گرانے والے وہ خود ہی تھے، یہ پڑھ کر پرندے گریہ و زاری کرتے ہیں۔ متن میں مولانا روم کے اشعار استعمال کیے گئے ہیں، نظم کارل مارکس کی ہے اور رام کا مکالمہ والمیکی کی رامائن سے ماخوذ ہے۔'[٦]

بے شک فہمیدہ ریاض نے ایک دنیا کی سیر خوشی، ناخوشی اور مجبوری سے کی اور تعلقات بنائے مگر اپنے واشگاف سیاسی نقطہ نظر کو چھپایا بھی نہیں اس لئے دنیا کے کئی شہر اور ملک ان کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ رہے ہوں گے مگر جنوبی ایشیا کے گنجان ترین اور تاریخی،نسلی اور لسانی طور پر الجھے ہوئے تین شہر ان کے دل میں بسے تھے کیونکہ وہ انسانی سطح پر ان کے لوگوں،قلم کاروں اور دانش وروں کی ہم نوا تھی،بلاشبہ وہ میرٹھ میں پیدا ہوئی مگر اس کی ساخت پرداخت حیدرآباد نے کی اور پھر وہ سندھ سے قلبی طور پر جڑی ہوئی تھی،سو تقریباً دو کروڑ کی آبادی کے کراچی میں نسلی طور پر مہاجر تھی، مگر ثقافتی طور پر سندھی تھی اور فکری اعتبار سے ایسی ترقی پسند کہ ہر مذہب،فرقے اور قومیت کے لوگوں سے ہم کلام ہو سکتی تھی،دوسرا شہر ڈھاکہ تھا جو 1971میں پاکستان کا مشرقی بازو نہ رہا،پاکستان میں احمد سلیم،وارث میر اور فہمیدہ ریاض جیسے لیکھک اور دانش ور گنتی کے تھے جنہوں نے ریاست کے عسکری اور 'نظریاتی بیانئے کے برعکس قتل عام، عصمت دری یا لسانی منافرت کا نشانہ بننے والوں کے ساتھ برملا یگانگت کا اظہار کیا۔اس لئے وہ حسینہ واجد کے ڈھاکہ کے بارے میں لکھتی ہے یا وہاں جا کر بہاری کیمپوں کا جائزہ لے کر ایک رپورٹ لکھنے کی کوشش کرتی ہے یا بنگلہ دیشی سے مشکل دنوں کی تاریخ کی باز دید کرتی ہے تو یہ رپورتاژ محسوس ہوتا ہے مگر وہ اسے ناول یا ناولٹ کہتی ہے، اور اسے 'زندہ بہار' کا عنوان دیتی ہے۔اس کے چند اقتباسات دیکھئے:

الف) 'دوسری تصویر چند مہینوں بعد کھینچی گئی تھی۔ سفید وسیاہ تصویر سے معلوم نہ ہوسکتا تھا کہ یہ جنگل ہے یا کوئی گاؤں۔ گھنے پیڑوں کے پس منظر میں کچھ بنگالی کھڑے تھے۔ تصویر کھنچوانے کے لیے وہ سب کیمرے کی طرف منھ کیے مسکرا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کٹا ہوا سر تھا، جسے اس نے بالو ں سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ ایک بہاری کا'، یا کسی غیر بنگالی کا سر تھا۔جس لڑکے نے یہ سر پکڑ رکھا تھا، اس کے چہرے پر ایسی خوش باشی کی ہنسی تھی جیسے اس کے ہاتھ میں آدمی کا کٹا ہوا سر نہیں، کوئی بڑی سی مچھلی ہو، جسے اس نے ابھی ابھی دریا سے پکڑا ہوا۔بہاری یا غیر بنگالی کا بقیہ دھڑ سامنے زمین پر پڑا تھا۔''[٧]

ب) ''کیمپ میں یہ بات آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ ایک پاکستانی بہاریوں سے ملنے آئی ہیں۔ ادھر اُدھر سے لوگ آکر جمع ہونے لگے۔ دو تین بہاری اپنے لیڈر کی تلاش میں نکل گئے۔ دیوار پران

کی سہ رنگی تصویر لگی تھی۔ نیچے لکھا تھا:''تین لاکھ دلوں کی دھڑکن فلاں صاحب

ج) 'دو چار برمحل اشعار بھی اِدھر اُدھرلکھے تھے۔ اسے پھر ہنسی آگئی، یہ سوچ کر کہ اُردو بولنے والے اشعار کتنی جلدی موزوں کرلیتے ہیں۔ کیچڑ کے تہذیب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسا کلچر جو ہر حال میں اور تقریباً ہر فرد سے تُک بندی کرا ہی دیتا ہے، جیسے یہاں سے بیس منٹ کی پرواز کے فاصلے پر واجد علی شاہ نے کلکتہ کے مٹیا برج میں ہائے ہائے کرتے ہوئے، کراہتے، جھینکتے، تُک بندی میں اس وقت کی تاریخ رقم کی۔'(۸)

(د) 'یہ کیا تماشا ہے؟''فہمیدہ ریاض نے دلی کوفت کے ساتھ کہا۔''آپ لوگ پہلے مرواتے ہیں، پھر سپریم کورٹ سے انکوائری کرواتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کو بھی مروا ڈالتے ہیں۔ اور کوئی تیسرا شخص صدر بن جاتا ہے۔ہاں، کچھ عجیب سا حال ہے۔ بھئی سچ تو یہ ہے .....سونیا جی نے رازداری کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا:بعض لو گوں کا خیال ہے کہ جو فوجی پاکستان سے ہمیں لوٹائے گئے تھے، دراصل یہ سب ان کا کیا دھرا ہے۔ جنگ ِ آزادی میں شامل فوج اور پاکستان سے واپس لوٹائی فوج میں ملاپ نہیں ہوسکا۔''(۹)

قیام پاکستان سے پہلے ہی بمبئی ایک طرف فلمی مرکز تھا،دوسری طرف اردو کی صف اول نے افسانوں میں اسی شہر کی کھولیاں بھی دکھائیں اور چمکیلی دنیا بھی اور پھر یہاں مزدور انجمنیں تھیں،کمیونسٹ پارٹی کے مہم جو ارکان بھی یہاں تھے اور انڈر ورلڈ کے ڈان،منشیات کے سمگلر اور جرائم کو پروان چڑھا کے غریبوں کے لئے لنگر خانے بنانے والے۔پھر اسی شہر میں ہندواتا کی لہر چلی،جس نے اس شہر کی کایا پلٹ کے رکھ دی ہندو نسل پرست ہند مسلم کلچر کی ایک ہزار برس کی روایت کو مسمار کرنے لگے۔فہمیدہ نے اس شہر پر 'گوداوری' کے عنوان سے لکھا،انہی اقتباسات سے آپ کو پتا چلے گا کہ گوداوری کون تھی اور نچلے طبقے میں وہ کیوں مقبول تھی؟

(i) ''وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر کالمی لمبی پلکیں جھپکائے بنا، اس نے ماسے عجب بے خوفی سے کہا:مرد کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے بائی۔ مرد کتا ہے!آپ کیوں پھکر کرتی ہے؟مرد لوگ اِدھر اُدھر ڈبلی لگا لیتا ہے اس کا کچھ گِھس تو نہیں جاتا اور نہ عورت کا کچھ گِھس جاتا ہے۔ دونوں جیسے کے تیسے رہتے ہیں۔نہیں، میں فکر نہیں کرتی، مانے کچھ بد دلی سے ہنس کر کہا، مگر .....میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔'(۱۰)

(ii) 'مہاراشر کے قصباتی علاقے کپڑے کی چھوٹی صنعتوں کے لیے مشہور ہیں۔ روزگار کی تلاش میں پورے ہندوستان سے کھنچ کھنچ کر بے روزگاروں کی ٹولیاں بمبئی اور اس کے آس پاس چھوٹے بڑے شہروں میں آتی ہیں، اور انجان سرزمین پر کسی اپنے سے .....اپنی بولی بولنے والے یا اپنے ہم مذہب سے .....دو وقت کی روٹی کی خاطر جڑ جاتی ہیں۔ یوپی، سی پی اور بہار سے لاکھوں مسلمان بھی یہاں آ بسے ہیں۔ زیادہ تر کپڑے کے کارخانوں میں چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں۔وہ شاید ایک مسلمان چھوٹے موٹے سرمایہ دار کے کپڑے کے کارخانے کے مزدور تھے جنہیں خود پر حملے کا خطرہ تھا، جو اس دن صبح ہی سے وہ مضافات میں اس کی کوٹھی کے پاس، اس کے ہی کھیت میں جاچھپے تھے۔ صبح دس بجتے بجتے، ان سے تعداد میں چوگنا بلوائیوں کا ہجوم، مسلمان کارخانے دار کی کوٹھی کے گرد جمع ہوگیا۔ کارخانے دار کی کوٹھی خالی تھی۔ اپنے خاندان کے ساتھ وہ روپوش ہوچکا تھا۔ مشتعل ہجوم نے دور دور نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دور دور تک کھیت کی ہریالی تھی۔ تب انہوں نے کھیتوں کو آگ لگا دی۔ لپٹوں سے تپے مسلمان مزدور بوکھلا کر باہر بھاگے۔ بلوائیوں نے کھیت سے نکلنے والوں کو گھیر کر، ان پر چاقوؤں اور چھریوں سے حملہ کردیا۔ زخمی تڑپتے ہوئے شکاروں کو انہوں نے واپس آگ میں جھونک دیا۔ شاید ان میں سے بھی ایک بھی زندہ بچ کر نکل نہ پایا تھا۔''(۱۱)

(iii) 'گو داوری مائی .....گوداوری پر ولیکر،دراصل گوداوری گوکھلے.....انڈین کمیونسٹ پارٹی کی ایک کارکن تھی، جیسا کہ اس پہاڑی سے اتر کر بمبئی میں سنچری بازار کے پاس پارٹی

آفس کے ریکارڈوں میں آپ کو پتہ چل سکتا ہے۔ 1945ء سے 1947ء تک کے دوران دو برسوں میں، اس کے کام نے زمینداروں کی مار کھاتے، بیگار بھرتے، ان کے اور پولیس کے ہاتھوں آئے دن قتل ہوتے آدی واسی وارلی کسانوں کو ایک حیرت اانگیز تحریک کی صورت میں منظم کردیا تھا۔پارٹی آفس ریکارڈ۔ گوداوری گوکھلے کی تحریر۔''یہ نومبر 1962ء کی بات ہے، جب میں او ر دوسرے ساتھی جیل میں تھے کہ مجھے کچھ یادداشتیں لکھنے کا خیال آیا۔ 1965ء میں جب ہمیں یروڑا سینٹرل جیل بھیجا گیا، میں نے کچھ لکھنا شروع کیا .....لوگ سوچیں گے، میں آدی واسیوں میں کیوں گئی تھی۔ دراصل جب 1942ء میں ہمیں جیل سے رہائی ملی تھی، تب میں نے اور کامریڈ شام راؤ نے مہاراشٹر کے کسانوں میں کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر جب 1945ء اور 1946ء میں ہمیں دوبارہ جیل بھیجا گیا،تھانے ڈسٹرکٹ سے علاقہ بدر کرنے کے بعد۔'(۱۲)

ڈیڑھ کروڑ سے زائد آبادی کا شہر کراچی قائد اعظم کا شہر تھا،پاکستان کا پہلا دارالحکومت اور کئی اعتبار سے جدید شہر مگر پرامن،اسے ڈکٹیٹروں اور ان کی اولادوں نے متشدد بنایا،پھر ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد اس کا سیاسی بھوت ختم کرنے لئے قوم پرست،لسانی جماعتیں بنائی گئیں، جنہوں نے اس شہر کو مقتل اور مرگھٹ بنا دیا،فہمیدہ ریاض نے اسے کوئی اور نام نہیں دیا بس 'کراچی' کہا اور بہت جرات کے ساتھ روشنیوں کے شہر کا گلا گھونٹنے والے دیدہ اور نادیدہ ہاتھوں کی نشاندہی کی۔

شاید موزوں تر ہو گا کہ ترقی پسندانہ خیالات سے اختلاف رکھنے والی خالدہ حسین(جولائی 1937 - جنوری 2019) کے خراج تحسین کو یہاں ریکارڈ کا حصہ بنایا جائے۔

''عصری منظر نامے میں ہمارے ہاں اگر کسی کوVersitile کا لقب زیب دیتا ہے تو وہ فہمیدہ ریاض ہے،اس نے فکشن میں بھی کیا ہنر دکھایا ہے،مگر مجھے سب سے زیادہ خوشی اس کے مابعد الطبیعاتی منطقے میں داخل ہونے کی ہے۔''(۱۳)

حوالہ جات

۱۔ نجمہ منظور،**باجی فہمیدہ ریاض،** کراچی:دنیا زاد، کتاب ۳۸، ص۱۱۷۔۱۳۰
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً
۴۔ محمد کاظم ، مرتب؛ **مکاتیب خضر از محمد خالد اختر،**لاہور: سنگِ میل ،۲۰۰۹ء، ص ۱۵۳۔۱۵۵
۵۔ انوار احمد، ڈاکٹر، **اردو افسانہ،ایک صدی کا قصہ،** ملتان: کتاب نگر ،۲۰۱۷ء،ص ۶۷۹
۶۔ ایضاً،ص: ۶۸۰
۷۔ فہمیدہ ریاض، **ہم لوگ،** اوکسفرڈ : زندہ بہار،۲۰۱۳ء، ص۲۷
۸۔ ایضاً، ص۳۱
۹۔ ایضاً، ص۹۹
۱۰۔ ایضاً،ص۱۳۳
۱۱۔ ایضاً،ص ۱۹۶
۱۲۔ ایضاً،ص۲۰۳
۱۳۔ **فیمینزم اور ہم،ادب کی گواہی،**مرتب: ڈاکٹر فاطمہ حسن 'نسائی خود شناسی اور فہمیدہ ریاض' از خالدہ حسین،وعدہ کتاب گھر،کراچی، ۲۰۰۵ء